© rasailojaraid.com

فتویٰ

حقیقت، اہمیت اور افتا کے ادارے کی تنظیم نو

ڈاکٹر یوسف فاروقی

دستور، قانون اور عملی احکام سے آگاہی معاشرے کے ہر فرد کی ضرورت ہے، اس لیے کہ آئین کی روح کو سمجھنا، قانون سے واقف ہونا اور اس کے مطابق عملی زندگی گزارنا ہر مذہب کے فرد کا فریضہ ہے۔ دینِ اسلام نے بالکل آغاز سے انسان کو بنیادی ضرورت کی طرف متوجہ کیا ہے۔

قانون پر اس کی روح کے مطابق عمل کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک علم نافع جو ہر فرد بشر کے فکری ارتقا اور استحکام کے لیے ضروری ہے۔ قرآن وسنت کی رو سے ہر مسلمان مرد اور عورت کا علم حاصل کرنا نہ صرف فرض ہے بلکہ حصول علم کا عمل مومن کی ساری زندگی میں تسلسل کے ساتھ جاری رہنا ضروری ہے۔ علمی اور فکری ارتقا کا رُک جانا عقل وشعور کی موت (Intellectual Death) کے مترادف ہے۔

وحی الٰہی کا آغاز سورۂ علق کی جن پانچ آیات سے ہوا ہے، ان سے دین میں تعلیم وتعلم، قلم وکتاب، مطالعے اور بحث وتحقیق کی اہمیت وضرورت مسلم امہ کے لیے پہلے دن سے ہی اُجاگر کر دی گئی تھی:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ o خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ o اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ o الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ o عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ o ...﴾ (العلق: ۱ تا ۵)

اے محمد ﷺ اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو جس نے (عالم کو) پیدا کیا۔ جس نے انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا۔ پڑھو اور تمھارا پروردگار بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جن کا اسے علم نہ تھا......

دوسری چیز وہ رویہ ہے جو قبول علم کے لیے لازمی ہے۔ یہ رویہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان اپنے آپ کو اخلاق فاضلہ سے آراستہ کر لیتا ہے، پھر اخلاص کے ساتھ علم کی طلب وجستجو پیدا ہو جاتی ہے۔ علم صفت خداوندی ہے۔ یہ عظیم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الشان صفت اس وقت اُجاگر ہوتی ہے جب انسان میں عبدیت کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ شعور عبدذات کو اُجاگر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان تزکیہ نفس کے عمل سے گزرے اور اپنے مزاج اور رویے میں فضائل اخلاق کو رچا بسا لے۔

جب یہ دونوں چیزیں انسان کو حاصل ہو جاتی ہیں تو پھر وہ نہ صرف یہ کہ علم وعمل کی لذت سے آشنا ہو جاتا ہے بلکہ دل میں قانون کی عظمت بھی اُجاگر ہو جاتی ہے اور قلب ودماغ میں مزید علم کی طلب اور ذوقِ تحقیق وجستجو بھی پیدا ہوتا ہے۔

عہدِ رسالت میں عوامی نمائندوں اور انتظامی عہدے داروں کی یہ ذمے داری ہوتی تھی کہ وہ لوگوں کو احکام وضوابط اور قاعدے وقانون سے آگاہ کرتے رہیں، نیز یہ کہ وہ خود بھی اخلاقی اقدار کے مالک ہوں اور معاشرے میں بہ طور معلم اخلاق اپنا کردار ادا کرتے رہیں۔ ابن حجر عسقلانیؒ عہدِ رسالت کے عوامی نمائندوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ لوگوں کے حقوق کی نگہ بانی بھی کرتے تھے اور قانون پر عمل درآمد بھی کراتے تھے۔

فتوے کی حقیقت یہ ہے کہ احکام ومسائل اور قانون کو صحیح صحیح دلیل کے ساتھ بتا دیا جائے، قانون کے اصول ماخذ ومصادر تو قرآن وسنت ہیں۔ یقینی بات یہ ہے کہ ہر قانون کو ان ہی کی روشنی میں دیکھنا اور پرکھنا ہوتا ہے۔ قرآن وسنت میں کوئی حکم موجود نہ ہو تو اس صورت میں دیگر شرعی دلائل کے ذریعے مسئلے کا حل تلاش کیا جاتا ہے۔ دلائل شرعیہ کے ذریعے استنباط واستدلال کے بہت سے مناہج ہیں، جن کی تفصیلات اجتہاد اور اصول فقہ کی کتب میں ملتی ہیں۔

فتوے، فیصلے اور رائے کا فرق:...... عام طور پر لوگ فتوے، فیصلے اور رائے کے فرق کو نظر انداز کر دیتے ہیں، اس کی وجہ سے بہت سی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں، اس لیے مناسب ہوگا کہ یہاں ان کے فرق کو نمایاں کر دیا جائے۔ جہاں تک رائے کا تعلق ہے تو وہ ہر صاحبِ علم وفکر کا حق ہے کہ وہ کسی مسئلے کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار دیانت داری کے ساتھ کرے۔

اظہارِ رائے کے لیے تین شرائط ہیں:

پہلی شرط اخلاص ہے، انسان جو بات بھی کہے وہ اخلاص ودیانت پر مبنی ہونی چاہیے۔

دوسری شرط علم ہے، جس شعبے سے متعلق کوئی فرد کسی مسئلے کے بارے میں رائے کا اظہار کر رہا ہے، اس سے متعلق وہ معلومات اور علم بھی رکھتا ہو۔

تیسری شرط یہ ہے کہ جو بات کہے وہ مدلل بھی ہو، دلیل کے بغیر رائے کو اہمیت نہیں دی جا سکتی۔

فتویٰ اس حکم یا رائے کو کہا جاتا ہے جو درجۂ افتا پر فائز باصلاحیت مفتی کی جانب سے جاری ہوتا ہے۔ مفتی کسی مسئلے کے بارے میں اپنے علم واجتہاد کی بنیاد پر یہ بتاتا ہے کہ زیرِ غور مسئلے میں شریعت کا نقطۂ نگاہ کیا ہے۔ شریعت کا نقطۂ نگاہ جب معلوم ہو جائے تو اس پر عمل کرنا چاہیے۔ انفرادی طور پر بھی عمل کرنا ضروری ہے اور اجتماعی طور پر بھی۔

فیصلہ اسے کہا جاتا ہے جو کسی بااختیار عدالت یا ایسے بااختیار ادارے کی طرف سے کیا جائے، جس پر عمل درآمد کے لیے لوگ قواعد وضوابط کے مطابق پابند ہوتے ہیں۔ بہ قول فقہا قاضی مجبر (یعنی اس کے فیصلے پر عمل لازم ہے) اور مفتی مخبر ہوتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے ہی میں افتا کا ادارہ وجود میں آ گیا تھا۔ خود رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے زندگی میں درپیش مسائل کے بارے میں دریافت کیا جاتا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے جوابات دیا کرتے تھے، لیکن جب مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی اور لوگ دور دراز کے علاقوں میں پھیل گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ان صحابہ کرام کو فتویٰ دینے کی اجازت عطا فرمائی جو علم وعمل اور تقویٰ واجتہاد کے لحاظ سے اس درجے پر پہنچ چکے تھے کہ لوگوں کی علمی فکری اور قانونی رہنمائی کرسکیں۔

عہدِ رسالت میں دواداروں کے قیام کی طرف خصوصی توجہ دی گئی تھی، ایک عدلیہ کا قیام، دوسرے افتا کا ادارہ۔ نظام قضا کی ذمے داری یہ تھی کہ وہ معاشرے میں عدل وانصاف قائم کرے، اور قانون کو بلا روک ٹوک اس کی صحیح روح کے ساتھ جاری ونافذ کرے۔ افتا کے ادارے کی ذمے داری یہ تھی کہ وہ لوگوں کو قانون کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے میں مدد کرے۔ جس طرح عدلیہ بے لاگ اور بلا معاوضہ انصاف مہیا کرتی تھی، اس طرح افتا کا ادارہ بھی کسی فیس یا معاوضے کے بغیر قانونی مشورے دیتا تھا۔ افتا کا ادارہ وقت کے ساتھ پھیلتا اور مستحکم ہوتا رہا۔ مفتی حضرات نہ صرف یہ کہ زبانی مسائل، احکام اور قانون کی وضاحت کرتے بلکہ بلا وقت ضرورت تحریری طور پر بھی قانون کی وضاحت کا فریضہ انجام دینے لگے۔ اگر کہیں کسی مسئلے میں کوئی الجھن پیدا ہوتی تو وہ تعبیر وتشریح کے اصولوں کی روشنی میں دلائل کے ساتھ الجھن کو دور کرنے کی سعی فرماتے اور کوشش کرتے تھے کہ ایسی تعبیر پیش کی جائے جو شریعت کی روح اور منشا سے زیادہ قریب ہو۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن صحابہ کرام کو فتویٰ دینے کی اجازت دی تھی، ان میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، ام المومنین حضرت عائشہؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نمایاں تھے۔ یوں تو صحابہ کرام کی بہت بڑی تعداد تھی، جس نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست علم حاصل کیا، لیکن درجۂ افتا پر فائز صحابہ کرام کی تعداد تقریباً سوا سو تھی۔ ان میں سے جو لوگ عملاً افتا کے کام میں مصروف رہے انھیں انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔ (الاشقر، عمر سلمان۔ تاریخ الفقہ الاسلامی، مکتبہ الفلاح، الکویت، ۱۴۱۰ھ/۱۹۸۹ء، ص ۷۹) بہرحال یہ تمام حضرات مستند اور اجازت یافتہ مفتی تھے اور لوگوں کو فقہ قانون سے آگاہی فراہم کیا کرتے تھے۔ لوگوں میں قانون کا علم اور شعور پیدا کرنے میں ان تمام حضرات کا نمایاں کردار ہے۔

افتا کی اہلیت وصلاحیت:...... فتویٰ دینا چونکہ ایک بھاری ذمے داری ہے، لہٰذا اس منصب کے لیے صلاحیت وقابلیت کو بھی بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ مفتی اور قاضی کے عہدے ایسے ہیں کہ ان پر بہت سوچ سمجھ کر باصلاحیت اور باکردار افراد ہی کا تقرر کیا جاسکتا ہے۔ ان کی قابلیت وصلاحیت کا کڑا معیار ہر صورت میں برقرار رکھنا چاہیے۔

افتا کے عہدے پر انتہائی سمجھ دار، تجربہ کار اور عاقل وبالغ مسلمان ہی کو فائز کیا جاسکتا ہے۔ مفتی کے لیے ضروری ہے کہ وہ قرآنِ حکیم اور اس کے علوم، سنت اور علوم الحدیث سے اچھی طرح واقف ہو، اجماعی مسائل کا علم رکھتا ہو۔ اجتہاد اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کے اسالیب سے اچھی طرح واقف ہو۔ نیز دلالت اور تشریح وتعبیر کے اصولوں کو خوب سمجھتا ہو۔ یہ اسی وقت ممکن ہو سکے گا جب اسے عربی زبان وادب پر عبور حاصل ہو۔ فقہا نے مفتی کے لیے یہ شرط بھی عائد کی ہے کہ وہ جس خطے میں بطور مفتی مقرر کیا جا رہا ہو، وہاں کے عرف وعادات، رسوم ورواج، زبان اور اس کی اصطلاحات کو خوب سمجھتا ہو۔ سب سے بڑی شرط یہ ہے کہ عمل وکردار، تقویٰ اور نیکی میں بھی نمایاں مقام رکھتا ہو۔

مفتی ایک حاذق طبیب کی طرح ہوتا ہے، جس طرح طبیب مرض کی تشخیص کرنے کے بعد علاج تجویز کرتا ہے، اس طرح مفتی بھی مستفتی کی الجھن کو اس کے احوال وظروف میں دیکھ کر سمجھتا ہے، غور وفکر کرتا ہے، پھر شریعت کے اصولوں کی روشنی میں مسئلے کا حل تجویز کرتا ہے، اس لیے بہت سے فقہا مفتی کے لیے مجتہد ہونا بھی تجویز کرتے ہیں، اس لیے کہ مفتی کے سامنے بہت سے نئے مسائل آتے ہیں۔ ہر ارتقا پذیر معاشرے میں زندگی کے ہر شعبے سے متعلق الجھنیں اور مسائل درپیش ہوتے ہیں، جن کا تعلق معیشت ونظم مملکت اور اجتماعی امور سے لے کر چھوٹے چھوٹے انفرادی امور ومسائل تک پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ ان تمام مسائل کے بارے میں لوگ مفتی حضرات سے رجوع کرتے ہیں، مفتی اپنے علم، تجربے، مطالعے اور اجتہادی بصیرت سے سوالوں کا جواب فتوے کی صورت میں پیش کرتا ہے۔

عام حالات میں جب کوئی فرد کسی مفتی سے کوئی مسئلہ زبانی دریافت کرتا ہے تو مفتی صاحب مسئلے کا جواب زبانی دیتے ہیں۔ اس صورت میں تفصیلات اور دلائل کی ضرورت نہیں ہوتی، نہ ہی مسئلہ دریافت کرنے والا دلائل اور حوالوں کا طلب گار ہوتا ہے۔ البتہ اگر تحریری طور پر فتویٰ پوچھا گیا ہو تو پھر فتویٰ دلائل اور حوالوں کے ساتھ ہونا چاہیے۔ اہم امور میں ایک مفتی کو چاہیے کہ وہ دوسرے مفتی اور اہل علم حضرات سے بھی مشورہ کرلے۔ ہمارے متقدمین کے ہاں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ وہ مستفتی کے سوالوں کو بطور مشورہ علما اور اہلِ مجلس کے سامنے رکھا کرتے تھے اور مشاورت کے بعد فتویٰ جاری کیا کرتے تھے۔ مشاورت کے لیے علما کی کوئی مشاورتی مجلس یا کونسل قائم ہو تو بہت اچھا ہوگا۔ پاکستان میں مشاورتی مجلس قائم کرنے کی کوششیں بھی ہوئی ہیں، کراچی میں بعض جید علما اور مفتی حضرات کی جانب سے ستر کی دہائی میں اس قسم کے تجربات ہوئے ہیں، لیکن مستقل بنیاد پر کوئی مجلسِ اسلامی قائم نہ ہو سکی۔ اگر مستقبل میں اس قسم کی کوئی مجلس فقہ قائم ہو جائے جو تمام مکاتبِ فقہ کی مشترکہ مجلس ہو تو وطن عزیز میں اس کے نتائج بہت اچھے اور مثبت ہوں گے۔ بہت سے ممالک میں مجالس فقہ اسلامی مختلف ناموں سے کام کر رہی ہیں اور ان کا علمی وفقہی کام بہت وقیع ہے۔

مفتی کا تقرر:...... مفتی کے تقرر کا مسئلہ بھی موجودہ حالات میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ برصغیر پاک وہند میں درسِ نظامی سے فارغ ہونے کے بعد بعض طلبہ جو فقہ اور افتا میں دلچسپی رکھتے ہیں، باقاعدہ افتا میں تخصص کرتے ہیں، فقہ وافتا میں تخصص کرنے والے حضرات اپنے نام کے ساتھ باقاعدہ مفتی لکھتے ہیں۔ علم الافتا میں تخصص کی سند لینے کے بعد یہ طلبہ اپنے آپ کو درجۂ افتا پر فائز تصور کرتے ہیں۔ ان میں ایسے طلبہ جنھیں فقہ اور افتا سے واقعی مناسبت ہوتی ہے اور ان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے تفقہ اور فہم سے ان کے اساتذہ مطمئن ہوتے ہیں، وہ مدارس کے دارالافتا سے وابستہ ہوجاتے ہیں اور تجربہ کار مفتی کی نگرانی میں معین المفتی (اسسٹنٹ مفتی) کے طور پر کام کرنے لگتے ہیں، اس طرح ان لوگوں کو مسلسل نگرانی اور رہنمائی ملتی رہتی ہے، لیکن ایسے مفتی حضرات کی تعداد بہت کم ہوتی ہے، اس کام کے لیے پاکستان میں چند بڑے مدارس ہیں، جہاں دارالافتا ایک اہم شعبے کے طور پر فریضہ انجام دے رہا ہے۔ باقی سینکڑوں وہ طلبہ جو افتا میں تخصص کرتے ہیں وہ مساجد، اسکول یا بعض تعلیمی اداروں سے وابستہ ہوجاتے ہیں، لیکن وہ سب اپنے آپ کو درجۂ افتا پر ہی فائز سمجھتے ہیں اور اپنی انفرادی حیثیت میں وہ یہ فریضہ انجام دیتے ہیں۔

مسلم معاشرے میں فتوے کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے کہ جب انسان فتویٰ دیتا ہے تو وہ اپنی بات نہیں کرتا بلکہ اس بات کا اظہار کررہا ہوتا ہے کہ اس مسئلے میں دین وشریعت کا مطلوب کیا ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے اس موقع پر کیا چاہتا ہے۔ اس لحاظ سے مفتی غیر معمولی اہمیت کا حامل ہوتا ہے، لوگ اس کی رائے کو خاص وزن دیتے ہیں، لہٰذا ان کے تقرر کا بھی ایک باوقار انداز ہونا چاہیے۔

ہماری رائے میں افتا کے ادارے کو عدلیہ کی طرز پر منظم اور مربوط بنانے کی ضرورت ہے۔ قومی اور ملکی سطح پر ایک صدر مفتی یا مفتی اعظم کا تقرر کیا جانا چاہیے اور پھر پورے ملک میں مفتی حضرات کا تقرر ہونا چاہیے۔ اس عمل کو انجام دینے کے لیے پہلے ملکی سطح پر علماء وفقہا پر مشتمل ایک کونسل کی تشکیل ہونی چاہیے، جسے مجلس العلماء یا کوئی اور نام دیا جاسکتا ہے، اس مجلس میں تمام مکاتب فقہ کے نمائندہ مفتیانِ کرام کو نمائندگی حاصل ہونی چاہیے۔ یہ کام ہمارے ملک کے علما خود ہی انجام دیں تو بہتر ہوگا۔ اس میں حکومت وسیاست کی کوئی مداخلت نہیں ہونی چاہیے۔

دوسری سطح پر ایک کمیٹی فیڈرل شریعہ کورٹ، شریعہ اپیلٹ بنچ، سپریم کورٹ کے علما، جج اور اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین پر مشتمل کمیٹی، مجلس العلما کی جانب سے تجویز کردہ ناموں اور ان کی صلاحیت کا جائزہ لے اور جو لوگ مقررہ صلاحیت پر پورا اُتریں انھیں بطور مفتی مقرر کردیا جائے۔ مفتیانِ کرام کا تقرر فیڈرل شریعہ کورٹ کے چیف جسٹس کی طرف سے جاری ہونا چاہیے۔ البتہ صدر مفتی یا مفتی اعظم کے لیے مندرجہ بالا کمیٹیوں کی روشنی میں اعلیٰ عدالت کے سربراہ (چیف جسٹس پاکستان) صدرِ مملکت کو اپنی سفارش کے ساتھ نام تجویز کردیں اور صدرِ مملکت تجویز کردہ شخصیت کو مفتی اعظم مقرر کردیں، مفتی اعظم کے تقرر کا دورانیہ طے کیا جاسکتا ہے۔ ہماری رائے میں ابتدا میں پانچ سال کے دورانیے کے لیے تقرر ہونا چاہیے۔ پھر اگر تمام کمیٹیوں کی نظر میں وہی شخصیت زیادہ موزوں ہو تو دوسرے پانچ سالہ دورانیے کے لیے بھی فرائض انجام دینے کے لیے مفتی اعظم سے درخواست کی جاسکتی ہے۔ ہذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

اس تجویز کردہ طریقہ کار کو اپنانے سے نہ صرف یہ کہ افتا کا ادارہ مستحکم ہوگا بلکہ زیادہ بہتر اور باوقار انداز میں اپنا کردار ادا کرسکے گا۔

© rasailojaraid.com